ہاؤس کو یہ اختیار نہیں ہوگا جو حقوق اس نے دیئے ہیں ان میں کمی کی جائے یا ان کو منسوخ کیا جائے۔

اب یہاں صورتِ حال یہ تھی خود اس اسمبلی کا بنایا ہوا آئین یہ اعلان کر رہا تھا کہ انہیں اس قسم کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہی نہیں تھا۔ آئین کا آرٹیکل 8، جس کا حوالہ حضور دے رہے تھے، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

Laws inconsistent with or in derogation of fundamental rights to be void.

(1) Any law, or any custom or usage having the force of law, in so far as it is inconsistent with the rights conferred by this Chapter, shall, to the extent of such inconsistency, be void.

(2) The State shall not make any law which takes away or abridges the rights so conferred and any law made in contravention of this clause shall, to the extent of such contravention, be void.

آئین کی اس شق کا مطلب واضح ہے کہ سٹیٹ کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ آئین پاکستان کے Chapter 1 میں مذکور انسانی حقوق سے متصادم کوئی قانون سازی کرے اور اس سے متصادم اگر قانون سازی کی جائے گی تو وہ کالعدم ہوگی اور اس آئین میں اس شق سے چند سطریں پہلے آرٹیکل 7 میں سٹیٹ کی تعریف بھی درج ہے اور اس تعریف کی رو سے پارلیمنٹ بھی سٹیٹ کا حصہ ہے اور اس طرح یہ پابندی پارلیمنٹ پر بھی عائد ہوتی ہے اور آئین کا آرٹیکل 20 یہ اعلان کر رہا تھا کہ ہر شخص کو اپنا مذہب profess کرنے practice کرنے اور propagate کرنے کی اجازت ہوگی۔

اب ملاحظہ کیجئے کہ اٹارنی جنرل صاحب نے اس دلیل کا کیا رد پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ لیکن پارلیمنٹ کو یہ اختیار ہے کہ وہ دو تہائی کی اکثریت سے آئین کے آرٹیکل 8 اور آرٹیکل 20 میں

اپنی رائے قائم کر سکیں گے۔

۵/ اگست کے روز جب کارروائی شروع ہوئی تو آغاز میں سپیکر اسمبلی صاحبزادہ فاروق علی صاحب نے کہا کہ اس وقت اٹارنی جنرل چیمبر میں مولوی ظفر احمد انصاری صاحب سے مشورہ کر رہے ہیں اور ان کے آنے پر چند منٹ میں ہم کارروائی کا آغاز کریں گے۔ پھر سپیکر اسمبلی نے اعلان کیا کہ کارروائی کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ جس نے سوال کرنا ہے وہ اپنا سوال لکھ کر دے گا اور اٹارنی جنرل یہ سوال جماعت کے وفد سے کریں گے۔ کارروائی کے آغاز پر اٹارنی جنرل یحیٰی بختیار صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کو حلف اُٹھانے کے لئے کہا۔ حضرت صاحب کے حلف اُٹھانے کے بعد اٹارنی جنرل نے واضح کیا کہ آپ نے اُن سوالات کے جواب دینے ہیں جو پوچھے جائیں گے اور اگر آپ کسی سوال کا جواب دینا پسند نہ کریں تو آپ انکار کر سکتے ہیں۔ لیکن اس انکار سے سپیشل کمیٹی کوئی نتیجہ اخذ کر سکتی ہے جو آپ کے حق میں اور آپ کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر آپ کسی سوال کا فوراً جواب نہ دینا پسند کریں تو آپ اس کے لیے وقت مانگ سکتے ہیں۔

پیشتر اس کے کہ ہم ان سوالات کا جائزہ لیں جو پوچھے گئے اور ان جوابات کو دیکھیں جو دیئے گئے یہ امر پیشِ نظر رہے کہ اس سپیشل کمیٹی کے سپرد یہ کام تھا کہ یہ فیصلہ کرے کہ اسلام میں ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے جو رسولِ کریم ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتے۔ اور ان کے سپرد اس مسئلہ کے متعلق آراء جمع کرنا اور اس مسئلہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے تجاویز تیار کرنا تھا۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ خواہ کسی کمیٹی کی تحقیقاتی کارروائی ہو یا کوئی عدالتی کارروائی ہو اور سوال پوچھے جائیں تو یہ سوالات پیشِ نظر مسئلہ کے بارے میں ہونے چاہئیں یا کم از کم ان سوالات کا اس مسئلہ کے متعلق تجاویز مرتب کرنے سے کوئی واضح تعلق ہونا چاہئے۔ اور کچھ نہیں تو سوالات کی اکثریت کا تعلق اس مسئلہ سے ہونا چاہئے۔ اگر کوئی ایک غیر متعلقہ سوال بھی پوچھے تو یہ بھی قابلِ اعتراض ہے کجا یہ کہ کوئی کئی روز غیر متعلقہ سوالات پوچھتا جائے۔

کارروائی کے آغاز سے یہ امر ظاہر تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب غیر متعلقہ سوالات میں وقت ضائع کر رہے ہیں اور اصل موضوع پر آنے سے کترا رہے ہیں۔ ان کا پہلا سوال حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بارے میں تھا۔ اگر یہ پیشِ نظر رہے کہ یہ کمیٹی کس مسئلہ پر غور کر رہی تھی تو یہی ذہن میں آتا

ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعاوی کیا تھے یا حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی شان میں آپ نے کیا فرمایا لیکن اٹارنی جنرل نے سوال کیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کب اور کہاں پیدا ہوئے، آپ کا خاندانی پس منظر کیا تھا، آپ کی تعلیم کیا تھی اور آپ نے کب اور کہاں وفات پائی۔ اس کے جواب میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ اس کا تحریری جواب جمع کرا دیا جائے گا۔ اٹارنی جنرل صاحب نے شکریہ ادا کیا اور موضوع تبدیل کیا۔ پھر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سے دریافت کیا

"You are the grandson of Mirza Ghulam Ahmad?"

اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا "ہاں"۔ اس کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سے ان کے حالاتِ زندگی دریافت کئے گئے۔

پھر یہ تفصیلات دریافت کرتے رہے کہ کیا آپ خلیفۃ المسیح، امام جماعت احمدیہ اور امیر المؤمنین تینوں منصبوں پر فائز ہیں۔ جب اس کا جواب اثبات میں دیا گیا تو یہ سوال کیا گیا کہ آپ ان مختلف عہدوں کے تحت کیا کام کرتے ہیں اور یہ مختلف عہدے کن اختیارات کے حامل ہیں۔ اس پر انہیں بتایا گیا کہ یہ مختلف عہدے نہیں بلکہ امام جماعتِ احمدیہ، خلیفۃ المسیح اور امیر المومنین کے الفاظ ایک ہی شخص کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ پھر اٹارنی جنرل صاحب نے ایک اور مہمل سوال کیا کہ کیا جماعتِ احمدیہ اور Ahmadiyya Movement مختلف تنظیمیں ہیں۔ اس تمہید کے بعد اب امید کی جا رہی تھی کہ سوالات کا سلسلہ زیر بحث موضوع کی طرف آئے گا لیکن جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔

اس کے بعد یہ کہ جماعتِ احمدیہ میں انتخابِ خلافت کے قوانین کیا ہیں؟ کیا حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی تمام اولاد جو اب موجود ہے مجلسِ انتخابِ خلافت کی رکن ہوتی ہے۔ اس پر جب انہیں یہ بتایا گیا کہ ایسا نہیں ہے تو وہ اس بحث کو لے بیٹھے کہ کیا جماعتِ احمدیہ میں خلیفہ کو معزول کیا جا سکتا ہے؟ جب ان کو بتایا گیا کہ ایسا نہیں ہوسکتا تو پھر اٹارنی جنرل صاحب نے یہ سوال اُٹھایا کہ کیا خلیفہ کے حکم کو Over rule کیا جا سکتا ہے۔ یہ بالکل غیر متعلقہ سوالات تھے۔ جماعتِ احمدیہ میں خلافت کا انتخاب کیسے ہوتا ہے؟ خلافت کا کیا مقام ہے؟ خلافت کے احکامات کا مقام کیا ہے؟ یہ احمدیوں کا مسئلہ ہے۔ قومی اسمبلی کا اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

واضح رہے کہ یہ قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی کی کارروائی ہو رہی تھی اور قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی کی

کارروائی جس قاعدہ کے تحت ہوتی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

(B) Special Committees: The assembly may by motion appoint a special committee, which shall have such composition and functions as may be specified in the motion.

(National Assembly of Pakistan, Rules of procedures and conduct of business in teh National Assembly 2007p84)

اس قاعدہ سے ظاہر ہے کہ سپیشل کمیٹی کی کارروائی اس کام کی حدود کی پابند ہوتی ہے جو کہ اس کے لئے قومی اسمبلی نے متعیّن کئے ہیں اور یہ کمیٹی اس کام کو سرانجام دے کر اپنی رپورٹ قومی اسمبلی میں پیش کرتی ہے اور اس سپیشل کمیٹی کے لئے یہ کام مقرر ہوا تھا کہ یہ فیصلہ کرے کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کو آخری نبی نہیں تسلیم کرتا، اس کی اسلام میں کیا حیثیت ہے؟ اب اس معاملہ پر جماعتِ احمدیہ کا موقف محضر نامہ کی صورت میں اور جماعتِ احمدیہ کے مخالف ممبران اسمبلی کا موقف اور محضر نامہ کا جواب بھی تحریری صورت میں سامنے آچکا تھا۔ اس پس منظر میں یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ اب سپیشل کمیٹی میں سوالات اس متعلقہ موضوع پر ہوں گے لیکن اتنے دنوں کی کارروائی میں کچھ اور ہی منظر سامنے آتا رہا۔

اس کے بعد وہ اس تفصیلی بحث میں الجھ گئے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں احمدیوں کی تعداد کیا تھی؟ اور اب یہ تعداد کتنی ہے؟ انہوں نے دریافت کیا کہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان میں احمدیوں کی تعداد کیا تھی؟ ۱۹۳۶ء میں یہ تعداد کتنی ہو گئی تھی؟ اور اب پاکستان میں احمدیوں کی تعداد کتنی ہے؟ انگریز حکومت کی مردم شماری کے مطابق یہ تعداد کتنی تھی؟ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر کے مطابق یہ تعداد کتنی تھی؟ اور دونوں میں فرق کیوں ہے؟ یہ کارروائی پڑھتے ہوئے کچھ سمجھ نہیں آتی کہ صاحب موصوف یا ان کو سوال دینے والے کیا بحث لے بیٹھے تھے۔ ان کی یہ بحث اس لیے بھی زیادہ نامعقول معلوم ہو رہی تھی کہ شروع میں ہی حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرما دیا تھا کہ ہمارے پاس بیعت کنندگان کا کوئی صحیح ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اور مذکورہ معاملہ کا احمدیوں کی تعداد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر

پاکستان میں صرف پانچ یا چھ احمدی تھے اور ان کا عقیدہ اسلامی تعلیمات کے مطابق تھا تو ان کی تعداد کی بنا پر ان کو غیر مسلم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اگر بالفرض پاکستان میں چھ سات کروڑ احمدی بھی تھے مگر ان کا عقیدہ غلط تھا تو اپنی زیادہ تعداد کی بنا پر وہ راسخ العقیدہ نہیں بن سکتے تھے۔ اور نہ ہی ان کی تعداد سے ان کے مذہبی اظہار کے بنیادی حق پر کوئی فرق پڑتا تھا۔

اس کے بعد کارروائی آگے بڑھی تو اس کے پڑھنے سے یہی تاثر ملتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب کا وقفہ سے کچھ دیر قبل یہ تاثر ابھرنا شروع ہوا کہ شاید اب زیر بحث معاملہ کے متعلق سوالات شروع ہوں۔ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے خطبہ جمعہ کا حوالہ دیا جس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے آئین کے آرٹیکل ۸ اور ۲۰ میں مذہبی آزادی کی ضمانت کا حوالہ دیا تھا۔ اور یہ سوال اٹھایا کہ اگر پارلیمنٹ چاہے تو دو تہائی کی اکثریت سے ان شقوں کو تبدیل کر سکتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پارلیمنٹ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کہ وہ کیا نتیجہ نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر ملک کے آئین میں پارلیمنٹ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اگر مطلوبہ تعداد میں اراکین اس کے حق میں رائے دیں تو ملک کے آئین میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔ لیکن آئین کی ہر شق اور ہونے والی ہر ترمیم کو بعض مسلّمہ بنیادی انسانی حقوق کے متصادم نہیں ہونا چاہئے خاص طور پر اگر اسی آئین میں ان حقوق کی ضمانت دی گئی ہو۔ مثلاً جس زمانہ میں جنوبی افریقہ کے آئین میں مقامی باشندوں کو ان کے حقوق نہیں دیئے گئے تو آخر کار پوری دنیا نے ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور یہ عذر قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا تھا کہ ان کے آئین میں ایسا ہی لکھا ہوا تھا اور اگر کسی ملک کی پارلیمنٹ ایسی کوئی آئینی ترمیم کر بھی دے جو بنیادی انسانی حقوق سے متصادم ہو تو اسے قبول نہیں کیا جاتا بلکہ بسا اوقات تو عدالت ہی اسے ختم کر دیتی ہے اور اندرونی دباؤ کے علاوہ پوری دنیا کی طرف سے ان پر دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ اس کو ختم کریں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس سوال کے جواب کے شروع میں ہی ان الفاظ میں یہ موقف واضح فرما دیا تھا

”...... یہ پارلیمنٹ ہماری جو ہے، یہ نیشنل اسمبلی یہ سپریم لیجسلیٹو باڈی ہے اور اس کے اوپر کوئی پابندی نہیں، سوائے ان پابندیوں کے جو یہ خود اپنے اوپر عائد کرے۔“

اور اس سے پہلے یہ بھی واضح فرما دیا تھا کہ پاکستان کا جو آئین ہے اس کی دفعہ 8 یہ کہتی ہے کہ اس

ترمیم کر دے۔ اوّل تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کیا بات کہہ گئے ہیں۔آئین تو واضح طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ پارلیمنٹ Chapter 1 میں مذکور انسانی حقوق سے متصادم کوئی قانون نہیں بنا سکتی اور ایسا قانون کالعدم ہوگا اور اٹارنی جنرل صاحب اس کا حل کیا تجویز فرما رہے ہیں؟ پہلے انہوں نے یہ کہا کہ پارلیمنٹ ان شقوں میں ترمیم کا اختیار رکھتی ہے پھر اس موقف کا معیار اور بھی گر گیا اور انہوں نے یہ کہا کہ پارلیمنٹ آرٹیکل 8 کو جس میں یہ پابندی لگائی گئی ہے مکمل طور پر ختم کرنے کا اختیار رکھتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہتے جا رہے ہیں کہ ان کے نزدیک پارلیمنٹ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔سیدھی سی بات ہے آئین کی رو سے پارلیمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہی نہیں اور یہ بات کہتے ہوئے اٹارنی جنرل صاحب کیا خوفناک راستہ کھول رہے تھے؟ وہ یہ راستہ کھول رہے تھے کہ دنیا کی کوئی بھی پارلیمنٹ بنیادی انسانی حقوق میں سے کچھ یا تمام حقوق کو سلب کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔جب ایک سے زیادہ مرتبہ ان کی توجہ آرٹیکل 8 میں پارلیمنٹ پر لگائی گئی پابندی کی طرف مبذول کرائی گئی تو اٹارنی جنرل جناب یحیٰ بختیار صاحب کو اور کچھ نہیں سوجھی تو اس کا یہ جواب دیا

Those are of political nature, religious nature but not of constitutional nature.

یعنی آئین میں پارلیمنٹ پر لگائی گئی یہ پابندی سیاسی اور مذہبی نوعیت کی ہے مگر آئینی نوعیت کی نہیں ہے۔

یہ جواب مہمل اور غلط ہونے کے علاوہ مضحکہ خیز بھی تھا۔یعنی آئین میں واضح طور پر یہ لکھا ہے اس باب میں لکھے ہوئے انسانی حقوق کو مکمل تحفظ حاصل ہے اور پارلیمنٹ یا کسی اور ادارہ کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ کسی قانون سازی کے ذریعہ ان میں کوئی کمی بھی کر سکے۔اور اٹارنی جنرل صاحب یہ فرما رہے ہیں کہ یہ تو محض سیاسی اور مذہبی قسم کی پابندی ہے آئینی پابندی نہیں ہے۔خدا جانے ان کے ذہن میں آئینی پابندی کا کیا تصور تھا۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے اس موضوع کے بارے میں ایک اور نکتہ بیان کیا۔ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ایک خطبہ جمعہ کا حوالہ سنایا جس میں حضور نے آئین کے آرٹیکل 20 کا حوالہ دیا تھا۔اس پر انہوں نے یہ اعتراض پیش کیا کہ اس آرٹیکل میں جس میں مذہبی

آزادی کی ضمانت دی گئی ہے پہلے یہ عبارت موجود ہے۔

Subject to law, public order and morality:-

یعنی یہ آزادی قانون، امن عامہ اور اخلاقیات کی حدود کی پابند ہوگی۔ ہم اس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے قبل اس آرٹیکل کی پوری عبارت درج کر دیتے ہیں:-

20. Freedom to profess religion and to manage religious institution

Subject to law, public order and morality:

a) Every citizen shall have the right to profess, practice and propagate his religion and

b) Every religious denomination and every sect thereof shall have the right to establish, maintain and manage its religious institutions.

اٹارنی جنرل صاحب کا کہنا یہ تھا اس آرٹیکل کی رو سے اگر اس قسم کی کوئی قانون سازی کی جائے تو احمدیوں کی یا کسی اور گروہ کی مذہبی آزادی پر قدغن لگائی جا سکتی ہے۔ حالانکہ آئین کی رو سے یہ دعویٰ بالکل غلط تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ

1)۔ 1974ء میں اس وقت ایسا کوئی قانون موجود نہیں تھا جس سے احمدیوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتے، یا اس کا اظہار نہیں کر سکتے یا کسی قسم کے شعائرِ اسلامی نہیں بجا لا سکتے، یا اپنے عقائد کی تبلیغ نہیں کر سکتے۔ آئین اور قانون اس قسم کی کوئی قدغن نہیں لگا رہے تھے۔

2)۔ آئین کے آرٹیکل 8 میں اس بات پر پابندی تھی کہ اس قسم کی کوئی قدغن لگانے کا کوئی قانون بنایا جائے اور ایسی ممکنہ قانون سازی کو کالعدم قرار دیا گیا تھا۔

اس سے یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس وقت پارلیمنٹ آئین میں مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر رہی تھی اور آئین کی رو سے انہیں اس قسم کی کسی آئینی ترمیم کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اس کو ہمیں مسلمان کہنا پڑے گا۔اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ ان کے ذہن میں اس بارے میں کچھ پیچیدگیاں ہیں۔وہ یہ بحث لے بیٹھے کہ آپ نے کہا ہے کہ قانون کی رو سے ہر فرد اور فرقہ کا مذہب وہی ہونا چاہئے جس کی طرف وہ اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے۔اس پر یحیٰی بختیار صاحب یہ دور کی کوڑی لائے کہ اگر ایک مسلمان طالب علم ڈاؤ میڈیکل کالج میں اقلیتوں کی سیٹ پر داخلے کے لیے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کرتا ہے تو کیا اسے قبول کرنا چاہئے۔اٹارنی جنرل صاحب یہاں بھی ایک غیر متعلقہ موازنہ پیش کر رہے تھے۔یہ مثال ہے کہ ایک طالب علم اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن داخلہ کے لیے جعلی اندراج کرتا ہے تاکہ اس جھوٹ سے ناجائز فائدہ اُٹھا سکے اور دوسری طرف ایک فرقہ ہے جو نوے سال سے دنیا کے بیسیوں ممالک میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا رہا ہے اور ان کے عقائد اچھی طرح سے مشتہر ہیں کہ وہ ہمیشہ سے اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں مسلمان کہتے ہیں مسلمان لکھتے ہیں اور اچانک ایک ملک کی اسمبلی زبردستی ان کی مرضی کے خلاف یہ فیصلہ کرتی ہے کہ آج سے وہ قانون کی نظر میں مسلمان نہیں ہوں گے۔دونوں مثالوں میں کوئی قدرِ مشترک نہیں۔بہر حال کارروائی میں ہونے والے سوالات زیرِ بحث موضوع کے قریب بھی نہیں آئے تھے کہ کارروائی مختصر وقفہ کیلئے رکی۔لیکن یہ پاکستان کی پارلیمانی تاریخ کا ایک سیاہ ترین دن تھا جب خود اٹارنی جنرل نے تمام ممبران اسمبلی کے سامنے بَرملا بڑے فخر سے یہ کہا تھا کہ پارلیمنٹ بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دینے والی شقوں کو منسوخ کر سکتی ہے اور اس طرح بنیادی انسانی حقوق تلف کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔حالانکہ آئین اعلان کر رہا ہے کہ سٹیٹ کو، حکومت کو پارلیمنٹ کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان حقوق میں کمی بھی کر سکے۔اسلام یہ سکھاتا ہے کہ کسی کو بنیادی انسانی حقوق سلب کرنے کی اجازت نہیں ہے لیکن اس اسمبلی کی اخلاقی حالت یہ تھی کہ کسی ایک ممبر نے بھی کھڑے ہو کر یہ نہیں کہا کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔یہ تو ہمارے آئین، ہماری اخلاقی قدروں اور ہمارے مذہب کی بنیاد ہے کہ کسی کو بھی ظالمانہ طریق سے بنیادی انسانی حقوق سلب کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے اور آپ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ہمیں یہ اختیار ہے اس شق کو ہی ختم کر دیں جو بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دے رہی ہے۔

یہی ایک پہلو اس بات کو واضح کر دیتا کہ یہ اسمبلی جو فیصلہ کرنے کا تہیّہ کئے بیٹھی تھی اس کا پہلا قدم ہی

یہ تھا کہ بنیادی انسانی حقوق کو سلب کیا جائے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ ممبرانِ اسمبلی سب سے پہلے اپنے بنائے ہوئے آئین کو پامال کرر ہے تھے۔

اب ہم ایک اور پہلو سے اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا کسی پارلیمنٹ/اسمبلی کو کوئی ایسا قانون بنانے یا آئینی ترمیم کرنے کا اختیار ہے جو وہ کسی شخص یا گروہ کے مذہب کا فیصلہ کر سکے۔ اس کا جواب یقیناً نہیں میں ہے۔

انسانی حقوق کی تمام دستاویزات سوچ اور مذہب کی آزادی کا خاص طور پر تحفظ کرتی ہیں۔ اقوام متحدہ کے "Universal Declaration of Human Rights" کے آرٹیکل نمبر 18 کے مطابق ہر انسان کو یہ مکمل آزادی ہے کہ وہ جو چاہے مذہب اختیار کرے اور اس پر عمل کرے۔ یہی حق "European Convention on Human Rights" کے آرٹیکل نمبر 9 میں بھی دیا گیا ہے۔ اسی طرح دنیا بھر کے آئین بھی اس حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ آئین پاکستان کے آرٹیکل نمبر 20 کے تحت بھی ہر شہری کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا آئینی ترمیم کے ذریعے کسی کے مذہب کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ Article 20 آئین کے Chapter 2 کے پہلے حصہ میں شامل ہے اور بنیادی انسانی حقوق کا حصہ ہے۔ یہ وہ حقوق ہیں جن کو آئین میں خاص حیثیت حاصل ہے اور کوئی قانون جو ان کے خلاف ہو غیر قانونی اور غیر آئینی متصور ہوتا ہے۔ برصغیر کے کچھ ملکوں کی عدالتوں نے ایسی آئینی ترامیم کو بھی غیر آئینی قرار دیا ہے جو آئین کے بنیادی ڈھانچے سے متصادم ہوں۔ اس سلسلہ میں بھارتی اور بنگلہ دیش سپریم کورٹ نمایاں ہیں۔ بھارتی سپریم کورٹ نے اپنے 2007ء میں دیئے گئے فیصلہ میں آئین میں دیئے گئے بنیادی حقوق کو بھی آئین کے بنیادی ڈھانچے کا حصہ قرار دیا ہے۔

(Coehlo Versus State of Tamil Nado (2007) 2SCC1)

اسی طرح بنگلہ دیش سپریم کورٹ نے بھی آئین کے بنیادی ڈھانچے کے اصول پر آئینی ترمیم کو کالعدم قرار دیا ہے۔

(Anwar Hossain Chaudhury VS Bangla Desh 1989, 18CCC (AD)J)

آئین کا آرٹیکل 20 پہلے دن سے آئین کا حصہ ہے اور بنیادی حقوق کے Chapter میں

شامل ہے۔ مذہبی آزادی عالمی طور پر ثابت شدہ حق ہے اور ان حقوق میں ہے جو ایمر جنسی کے دوران بھی معطل نہیں ہوتے۔ Article 233 & 233 Constitution of Pakistan یہ ان حقوق میں شامل ہیں جو آئین کے بنیادی ڈھانچہ کا حصہ ہیں اور پارلیمنٹ کوئی ایسی آئینی ترمیم بھی نہیں کر سکتی جو اس بنیادی حقوق کے برخلاف ہو اور جو کسی کے مذہب کا فیصلہ اس کی منشا اور مرضی کے خلاف کرے۔ مذہب انسان کا سراسر ذاتی معاملہ ہے۔ سابقہ امریکی صدر تھامسن جیفرسن جو امریکہ کے Founding Fathers میں سے ایک تھے انہوں نے کہا تھا:۔

".......Religion is a matter which lies solely between man and his God, that he owes account to none other for his faith or his worship, that the legitimate powers of government reaches actions only, and not opinions, I contemplate with sovereign reverence that act of whole American people which declared that their legislature should "Make no law respecting an establishment of religion, or prohibiting the free exercise thereof." Thus building a wall of seperation between church and State.

وقفہ کے بعد کارروائی شروع ہوئی۔ اٹارنی جنرل صاحب کے سوالات تو بعد میں شروع ہوئے لیکن ایک ممبر اسمبلی نے ایک اور مسئلہ کے بارے میں سوال پیش کر دیا۔ انہوں نے یہ سوال کیا کہ اگر اسمبلی میں تقاریر ہوں تو رپورٹرز اس کا متن تیار کر کے ممبران کو تصحیح کے لئے بھجوا دیتے ہیں، تو اب جو جماعت کا وفد ایک گواہ کی حیثیت سے بیان دے رہا ہے تو کیا اس کا ریکارڈ جماعت کے وفد کو تصحیح اور تصدیق کے لئے بھجوایا جائے گا؟ **اس کے جواب میں سپیکر صاحب نے کہا کہ جماعت کے وفد کو جماعت کے وفد کا بیان تصحیح اور تصدیق کے لئے بالکل نہیں بھجوایا جائے گا بلکہ ممبران کو** اس کا ریکارڈ بھجوایا جائے گا اور صاحبزادہ صفی اللہ صاحب نے بھی اس کی تائید کی۔ یہ ایک نہایت ہی قابلِ اعتراض فیصلہ تھا کیونکہ دنیا بھر میں کسی بھی سطح پر جب گواہ سے بیان لیا جاتا ہے تو پھر اس کا

تحریری ریکارڈ اس کو دیا جاتا ہے جسے وہ گواہ تسلیم کر کے یا پھر تصحیح کر کے دستخط کر کے دیتا ہے اور پھر یہ اس کا تصدیق شدہ بیان سمجھا جاتا ہے لیکن یہاں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ گواہ کو مکمل اندھیرے میں رکھا جارہا تھا کہ اس کا کیا بیان قلمبند کیا جارہا ہے۔ اور اس صورتِ حال میں یہ ریکارڈ مکمل طور پر صحیح طرح محفوظ رکھا گیا کہ نہیں؟ اس سوال پر کوئی حتمی رائے نہیں دی جاسکتی اور جماعتِ احمدیہ کو ایک فریق کی حیثیت سے اس ریکارڈ کی صحت کے متعلق سوال اُٹھانے کا پورا حق حاصل ہے۔

اٹارنی جنرل صاحب نے سوالات کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ ان سوالات کی طرز کا لبِّ لُباب یہ تھا کہ کسی طرح یہ ثابت کیا جائے کہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں مداخلت کرے یا اگر کوئی فرد یا گروہ اپنے آپ کو ایک مذہب کی طرف منسوب کرتا ہے تو حکومت کو یہ اختیار ہے کہ اس امر کا تجزیہ کرے کہ وہ اس مذہب کی طرف منسوب ہوسکتا ہے کہ نہیں۔

اس لایعنی بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ ایسی مثالیں پیش کر رہے تھے جو یا تو غیر متعلقہ تھیں یا ایسی فرضی مثالیں تھیں جن کو سامنے رکھ کر کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ میں قرآنِ کریم پر ایمان نہیں لاتا لیکن وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو کیا اسے مسلمان سمجھا جائے گا۔ اب یہ ایک فرضی مثال تھی جب کہ ایسا کوئی مسلمان فرقہ موجود ہی نہیں جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتا ہو اور یہ بھی کہتا ہو کہ ہم قرآن پر ایمان بھی نہیں لاتے اور ایسی فرضی اور انتہائی قسم کی مثال پر کوئی نتیجہ نہیں قائم کیا جاسکتا۔ پھر وہ یہ مثال لے بیٹھے کہ سعودی عرب میں مکہ اور مدینہ میں صرف مسلمان جاسکتے ہیں لیکن اگر کوئی یہودی اپنے فارم پر اپنا مذہب مسلمان لکھے اور اس بنا پر وہاں پر داخل ہو کر جاسوسی کرنے کی کوشش کرے تو کیا وہاں کی حکومت اسے گرفتار کرنے کی مجاز نہیں ہوگی۔ اس پر حضور نے یہ مختصر اور جامع جواب دیا کہ اسے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے الزام میں نہیں بلکہ ایک ملک میں جاسوسی کرنے کے الزام میں گرفتار کیا جائے گا اور یہ حقیقت تو سب دیکھ سکتے ہیں کہ اس مثال میں کسی مذہب کی طرف منسوب ہونا اتنا اہم نہیں، ایسے شخص پر تو جاسوسی کا الزام لگتا ہے۔ یہاں پر یحيٰی بختیار صاحب کو اپنی مثال کے بودا ہونے کا احساس ہو تو انہوں نے فوراً بات تبدیل کی اور کہا کہ فرض کریں کہ ایک عیسائی صحافی ہے اور وہ تجسس کی خاطر مکہ اور مدینہ دیکھنا چاہتا ہے اور فارم غلط اندراج (False declaration) کرتا ہے اور اپنے آپ کو

مسلمان ظاہر کرتا ہے تو کیا وہاں کی حکومت اسے روک نہیں سکتی۔ اس پر حضور نے جواب دیا کہ اسے تو False declaration کر دینے کی بنا پر گرفتار کیا جائے گا، غیر مسلم ہونے کی بنا پر گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ اب یہ مثال بھی زیر بحث معاملہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ ایک شخص کسی اور مذہب کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے اور اس نے کبھی اسلام قبول ہی نہیں کیا۔ وہ کسی مقصد کی خاطر غلط بیان دیتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان لکھتا ہے۔ اس شخص سے کوئی بھی معاملہ کیا جائے لیکن دوسری طرف بالکل اور صورتِ حال ہے۔ ایک فرقہ ہے وہ اپنے آپ کو ہمیشہ سے مسلمان کہتا رہا ہے اور اس نے کبھی بھی اپنے آپ کو کسی اور مذہب کی طرف منسوب نہیں کیا۔ ایک سیاسی اسمبلی ایک روز یہ فیصلہ سنانے بیٹھ جاتی ہے کہ اسے اپنے آپ کو مسلمان کہنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ دونوں بالکل مختلف نوعیت کی مثالیں ہیں۔

پھر اٹارنی جنرل صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع کی کہ بنیادی حقوق پر بھی حکومت قدغن لگا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے یہ معرکۃ الآراء مثال پیش کی کہ لیور برادرز کمپنی، لکس نام کا صابن بناتی ہے۔ اگر کوئی اور کمپنی اس نام سے صابن بنانے لگ جائے تو حکومت اسے روکے گی۔ یہ بھی ایک نہایت غیر متعلقہ اور لایعنی مثال تھی۔ صنعتی مصنوعات کے متعلق Patent کرانے کا قانون موجود ہے اور اگر ایک کمپنی چاہے تو اپنی قابلِ فروخت مصنوعات کو اس قانون کے تحت Patent کرا سکتی ہے اور اس کے بعد کوئی اور کمپنی ان ناموں سے منسوب مصنوعات فروخت نہیں کر سکتی۔ اسلام یا کوئی اور مذہب قابلِ فروخت آئیٹم تو نہیں کہ کوئی اور گروہ یہ نام استعمال نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی ایک فرقہ نے یہ نام Patent کرا کے اس کے استعمال کی اجارہ داری حاصل کی ہے۔ چنانچہ حضور نے اٹارنی جنرل صاحب پر واضح فرمایا کہ لیور برادرز کے پاس تو اس نام کو استعمال کرنے کی Monoply ہے اور عقیدہ پر کسی گروہ کی Monoply نہیں ہوتی۔ اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا فرض کریں کہ جہاں تک عقیدہ کا تعلق ہے کسی کے پاس اس کی Monoply نہیں ہے لیکن میں ابھی اس موضوع کی طرف نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب اس موضوع کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی اس کی طرف انہوں نے آنے کی کبھی کوشش کی۔ اس موقع پر حضور نے یہ مثال بیان فرمائی کہ اگر ایک گروہ کہے کہ عیسائیت کا نام صرف وہی گروہ استعمال کر سکتا

ہے اور دوسرے گروہ یا فرقے یہ نام استعمال نہیں کر سکتے۔ یقیناً لکس صابن کی فروخت کی بجائے یہ مثال زیرِ بحث موضوع کے مطابق تھی۔ اس پر اٹارنی جنرل صاحب کافی جز بز ہوئے اور کہنے لگے کہ

I am not anticipating any thing please. I am just dealing with the restriction of the human rights.

ایک بار پھر یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب اصل موضوع کی طرف آنے کی بجائے اِدھر اُدھر کی باتوں پر وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ان کی پیش کردہ مثالیں اس قدر دوراز حقیقت اور موضوع سے ہٹ کر تھیں کہ حضور کو سوال کر کے کوشش کرنی پڑتی تھی کہ اصل بات واضح ہو اور سوال و جواب کا سلسلہ اپنے اصل موضوع کی طرف واپس آئے اور اٹارنی جنرل صاحب غلط سوال کر کے خود الجھن میں پھنس جاتے تھے۔

لیکن اس مرحلہ پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بیچارگی کچھ بوکھلاہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ حکومت کو مذہبی آزادی پر قدغن لگانے کی اجازت ہے ایک بالکل لایعنی سی مثال دے ڈالی۔ انہوں نے مثال دی کہ ہندوستان میں بعض صوبوں میں گائے کی قربانی کی اجازت نہیں۔ اس پر انہیں یاد دلایا گیا کہ اوّل تو اسلام میں ہر شخص پر بقر عید کے موقع پر قربانی کرنا لازم نہیں بلکہ صرف صاحب استطاعت پر ہے اور گائے کی قربانی کرنا بھی فرض نہیں ہے بکرے کی قربانی بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اپنے نکتے کو ثابت کرنے کے لئے اٹارنی جنرل صاحب نے ایک فرضی آدمی کی مثال پیش کی اور وہ مثال ہم ان کے الفاظ میں ہی درج کر دیتے ہیں۔

''......اگر ایک آدمی کے پاس صرف گائے ہے بقر عید پر اور وہ بیچارا اس کو قربان کرنا چاہتا ہے ......اور وہ کہتا ہے کہ میرے پاس پیسے ویسے ہیں اور گائے بھی میرے پاس ہے......''

خدا جانے وہ اس گائے والے آدمی کی مثال پیش کر کے کیا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جب حضور نے ان کی مضحکہ خیز مثال سن کر فرمایا کہ اگر اس شخص کے پاس پیسے ہیں تو وہ قربانی کے لئے دنبہ کیوں نہیں خرید لیتا۔ بیچارے اٹارنی جنرل صاحب کو اس کے بعد اس مثال کو ترک ہی کرنا پڑا۔ ہر پڑھنے والا اس بات کو دیکھ سکتا ہے کہ یہ کوئی متعلقہ مثال نہیں۔ معیّن طور پر گائے ذبح کرنے کا حکم نہیں۔ بکرا بھی ذبح کیا جا سکتا ہے اور اگر یہ شخص قربانی نہیں بھی کر سکے تو اس کو

اپنے ضمیر کے خلاف کوئی اعلان نہیں کرنا پڑتا اور اس مثال کی اس بات سے کوئی مناسبت نہیں کہ ایک فرقہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے، مسلمان کہتا ہے اور کسی اور مذہب کی طرف اپنے آپ کو منسوب نہیں سمجھتا اور ایک دن کوئی اسمبلی یہ نامعقول فیصلہ کرے کہ آج سے قانون کی رو سے اس فرقہ کو مسلمان شمار نہیں کیا جائے گا۔

اس کے بعد انہوں نے پھر کچھ فرضی مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں مداخلت کرے۔ پہلے انہوں نے اس غرض کے لئے یہ کوشش کی کہ آئین کے Preamble کا حوالہ دیا کہ اس میں لکھا ہے

Wherein the Muslims shall be enabled to order their lives in the collective and individual spheres in accordance with the teachings and requirements of Islam.........

اس بنیاد پر وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ریاست کو مذہبی معاملات میں مداخلت اور قانون سازی کا اختیار ہے۔ اس پر حضور نے یہ نشاندہی فرمائی کہ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ ہر فرقہ اور ہر گروہ کو اپنے اپنے نظریات اور ضمیر کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی اور سہولت دی جائے گی اور یحیٰی بختیار صاحب اگر صرف اس Preamble کو ہی پورا پڑھ لیتے تو انہیں احساس ہو جاتا کہ ان کی دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے کیونکہ جس سطر کا وہ حوالہ دے رہے تھے، اس سے اگلی سطر ہے:-

Wherein adequate provision shall be made for the minorities freely to profess and practice their religions and develop their cultures.

اب یحیٰی بختیار صاحب خواہ اپنے ذہن میں احمدیوں کو مسلمان سمجھتے تھے یا کوئی غیر مسلم اقلیت تصور کر رہے تھے ، یہ Preamble یہی اعلان کر رہا تھا کہ احمدیوں کو جو بھی ان کا مذہب ہے اس کا اعلان کرنے ، اس پر عمل کرنے کی مکمل اجازت ہے۔ اور احمدیوں کا ہمیشہ سے اعلان ہے کہ ان کا مذہب اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اور اس Preamble کی رو سے بھی انہیں اس بات کی پوری

آزادی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہیں، اس کا اعلان کریں اور اس پر عمل کریں۔ پارلیمنٹ کو یا حکومت کو یا کسی اور کو یہ حق نہیں تھا کہ ان کو کسی اور مذہب کی طرف منسوب کرے۔ ابھی یحیٰ بختیار صاحب نے یہ دلیل ختم ہی کی تھی کہ انہوں نے اپنی ہی دلیل کا رد کر ڈالا اور خود فرمایا

Preamble is not enforceable.......

یعنی Preamble آئین کا وہ حصہ ہے جس کی تعمیل ضروری نہیں۔

اگر ان کے نزدیک ایسا ہی تھا تو پھر اس Preamble کو بنیاد بنا کر یہ بحث اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی کہ ریاست کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں مداخلت کرے۔

پھر انہوں نے آئین کے کچھ حصوں کو بنیاد بنا کر کچھ فرضی مثالیں پیش کر کے حضور سے دریافت کیا کہ کیا اس صورت میں ریاست کے لئے ضروری نہیں ہو گا کہ وہ کسی شخص کے مذہب کے بارے میں فیصلہ کرے۔ مثلاً ایک شخص غیر مسلم ہے لیکن وہ صدر یا وزیر اعظم کے انتخاب میں حصہ لینے کے لئے کاغذات جمع کرا دیتا ہے مگر فرضی مثالوں پر بنیاد بنا کر کوئی معنی خیز گفتگو آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جب حضور نے دریافت فرمایا کہ اس وقت کیا قانون ہے یہ فیصلہ کون کرے گا کہ یہ شخص مسلمان ہے کہ نہیں؟ تو پہلے اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ چیف الیکشن کمشنر کرے گا۔ پھر جب حضور نے دریافت فرمایا کہ کیا وہ اس مفروضے پر کاغذات مسترد کر سکتا ہے؟ تو اٹارنی جنرل صاحب نے خود کہا کہ نہیں! فرض کریں کہ وہ نہیں کر سکتا لیکن اس پر اعتراض ہوتا ہے اور اسی گفتگو کے دوران اپنی مثال کو تبدیل کر کے کہا کہ یہ فرضی شخص جو صدر یا وزیر اعظم بننے کے لئے کاغذات جمع کراتا ہے وہ اسلام کے بنیادی اراکین میں سے کسی ایک مثلاً زکوۃ کا انکار کر دیتا ہے پھر کیا ہو گا۔ پھر کہا کہ فرض کریں کہ ایک عیسائی مسلمان ہونے کا اقرار نامہ جمع کرا کے ان انتخابات میں حصہ لینے کی کوشش کرتا ہے تو کیا ہو گا۔ ان کی مثالیں صرف فرضی ہی نہیں بلکہ کئی پہلوؤں سے افسانوی بھی تھیں۔ یہ حصہ پڑھتے ہوئے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر فرضی مثال ہی پیش کرنا مقصد تھا تو وہ واضح ذہن کے ساتھ ایک معین مثال کیوں پیش نہیں کر رہے تھے۔ کبھی ایک مثال پیش کرتے تھے اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر بالکل مختلف مثال پیش کر دیتے تھے۔ دورانِ گفتگو انہیں خود بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ غلطی پر غلطی کر رہے ہیں اور انہیں خود کہنا پڑا

I am just giving you a ridiculous example

یعنی میں آپ کو صرف ایک نا معقول مثال پیش کرر ہا ہوں

اب ہر پڑھنے والا یہ دیکھ سکتا ہے کہ نا معقول اور افسانوی مثالوں کو بنیاد بنا کر کوئی قانون سازی نہیں کی جا سکتی، کوئی سنجیدہ رائے نہیں دی جا سکتی اور نہ کسی نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے۔

اس صورتِ حال کے پس منظر میں اس سیشن کے اختتام پر حضور نے فرمایا:۔

I have already. humbly submitted so many times that these extreme examples, these imaginary examples, cannot solve the problem we are facing today. Let us face the facts.

یعنی میں پہلے بھی کئی مرتبہ عاجزی سے یہ کہہ چکا ہوں کہ یہ فرضی مثالیں اور یہ انتہائی نوعیت کی مثالیں ان مسائل کو حل نہیں کر سکتیں جن کا ہمیں آج سامنا ہے۔ ہمیں حقائق کا سامنا کرنا چاہئیے۔

اب تک جماعت کے مخالفین پر یہ امر واضح ہو چکا تھا کہ یہ بحث ان کی توقعات کے مطابق نہیں جا رہی اور جماعت احمدیہ پر گرفت کرنے کا موقع نہیں پا رہے۔ چنانچہ شاہ احمد نورانی صاحب نے سپیکر اسمبلی کو کہا کہ جو سوال کیے جاتے ہیں یہ ان کا معیّن جواب نہیں دیتے، ان کو پابند کیا جائے کہ وہ معیّن جواب دیں۔ اور یہ الٹا اٹارنی جنرل صاحب سے سوال کر کے ٹال دیتے ہیں۔ یہ طریق غلط ہے انہیں پابند کیا جائے کہ یہ جواب پورا دیں۔ ایک اور ممبر نے یہ شکوہ کیا کہ لگتا ہے کہ یہ جرح کر رہے ہیں۔ اس پر سپیکر اسمبلی نے کہا کہ

He has got his own methods

ان کا اپنا طریقہ ہے۔

اب یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس سیشن کے اختتام پر ایسی فرضی مثالیں پیش کر کے سوال کئے گئے تھے جن مثالوں کے بارے میں خود اٹارنی جنرل صاحب کا کہنا تھا کہ وہ نا معقول مثالیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نا معقول مثالوں کو سامنے رکھ کر تو کوئی معین جواب نہیں دیا جا سکتا۔

اس مرحلہ پر چھ بجے شام تک کے لیے کارروائی ملتوی کر دی گئی۔ چھ بجے شام کارروائی پھر شروع ہوئی تو اٹارنی جنرل صاحب نے موضوع کی طرف آنے کی بجائے ایک بار پھر یہ سوال چھیڑ دیا کہ پاکستان میں احمدیوں کی تعداد کیا ہے۔ اس پر آخر کار حضور نے فرمایا کہ میں کوئی بھی عدد وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ مختلف لوگوں نے جو پاکستان میں احمدیوں کی تعداد بیان کی ہے وہ صرف اندازے ہیں اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر پانچ آدمیوں پر بھی ظلم کیا جائے تو وہ بھی اتنا ہی بُرا ہوگا۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے اپنی گفتگو کا رخ ایک اور طرف پھیرا۔ اگرچہ بظاہر ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ احمدیوں کو آئین میں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے بلکہ ابھی بحث اپنے اصل موضوع پر بھی نہیں آئی تھی لیکن یحیٰ بختیار صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دی کہ اگر احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے تو اس سے ان کے حقوق پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اوّل تو یہ بات ہی لایعنی تھی کہ ایک فرقہ اپنے آپ کو ایک مذہب کی طرف منسوب کرتا ہے اور ایک سیاسی اسمبلی یہ فیصلہ کر دیتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے آپ کو اس مذہب کی طرف منسوب نہیں کر سکتا۔ اور اس کے ساتھ آپ کے آئین میں یہ بھی لکھا ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب کو Profess کر سکتا ہے۔ اور پھر یہ بھی اصرار کیا جا رہا ہے کہ اس سے آپ کا کوئی حق متاثر بھی نہیں ہوگا۔

یہ بحث کرتے ہوئے اٹارنی جنرل صاحب نے کہا

....I am just saying that your religion will not be affected because nobody is going to stop you from....

یعنی ’’میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ کا مذہب متاثر نہیں ہوگا کیونکہ کوئی آپ کو روکے گا نہیں۔۔‘‘

اس کے جواب میں حضور نے فرمایا

But my religion is affected; if my religious feelings and passions are affected, my religion is affected

یعنی ’’مگر میرا مذہب متاثر ہوتا ہے۔ اگر میرے مذہبی احساسات اور جذبات متاثر ہوتے ہیں تو میرا مذہب متاثر ہوتا ہے۔‘‘

اگر اٹارنی جنرل صاحب کو یا اس وقت وہاں پر موجود ممبرانِ قومی اسمبلی کو پاکستان کے آئین میں یا کسی اور ملک کے آئین میں جس میں وہ جائیں، ترمیم کر کے غیر مسلم قرار دیا جاتا تو کیا وہ یہی کہتے کہ اس سے مذہبی طور پر ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا، ہمارے حقوق محفوظ ہیں۔ یقیناً وہ ایسا نہ کہتے بلکہ وہ اس پر شدید احتجاج کرتے۔

لیکن اس کے بعد انہوں نے جو تفصیلی دلائل بیان کیے وقت نے ان دلائل کو غلط ثابت کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ غیر مسلم قرار دیئے جانے کے بعد احمدیوں کے حقوق محفوظ ہو جائیں گے اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اگر آپ کو غیر مسلم نہ قرار دیا گیا تو آپ کے حقوق محفوظ رہیں گے کہ نہیں۔ ان کے معین الفاظ یہ تھے:-

No, once you are declared a minority, your rights are protected, Mirza Sahib...If you are not declared a minority then I am not sure if your rights will be protected.

یعنی مرزا صاحب! ایک مرتبہ آپ کو اقلیت قرار دے دیا جائے تو آپ کے حقوق محفوظ ہو جائیں گے۔ اگر آپ کو اقلیت نہ قرار دیا گیا تو پھر میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے حقوق محفوظ رہ سکیں گے۔

ایک ملک کے ممبرانِ پارلیمنٹ کے سامنے اٹارنی جنرل کے منہ سے یہ جملہ اس ملک کے آئین کی ہی توہین تھی یعنی اگر کوئی فرقہ اپنے عقیدہ کے مطابق ایک مذہب کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرے تو پارلیمنٹ میں اٹارنی جنرل صاحب فرما رہے تھے کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ان کے حقوق محفوظ رہیں گے کہ نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر ملک میں آئین اور قانون کا فائدہ ہی کیا ہے۔ پھر اس آئین میں مذہبی آزادی بلکہ کسی قسم کی آزادی کا ذکر ہی فضول ہے۔ یہ عجیب نامعقولیت تھی کہ ایک ملک کا اٹارنی جنرل ملک کی قانون ساز اسمبلی میں یہ کہہ رہا ہے کہ اگر آپ نے اپنے ضمیر کے مطابق اپنے مذہب کا اعلان کیا تو آپ کے حقوق کی کوئی ضمانت حکومت نہیں دے سکتی لیکن اگر آپ نے جھوٹ بولا اور اپنے ضمیر کے خلاف کسی اور نام سے اپنے مذہب کو منسوب کیا تو پھر ہم آپ کے حقوق کی حفاظت کریں گے۔ اس گفتگو کا ایک پس منظر ہے۔ جب قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں یہ

کارروائی ہو رہی تھی تو اس وقت کچھ ماہ سے پورے پاکستان میں احمدیوں کو قتل کیا جا رہا تھا، ان کے اموال لوٹے جا رہے تھے، ان کے گھروں کو آگ لگائی جا رہی تھیں اور اس وقت حکومت کی مشینری فسادات کو روکنے کی بجائے نہ صرف خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی بلکہ کئی مقامات پر مفسدین کی اعانت کر رہی تھی اور یہ سب ظلم کرنے کے بعد اب جب جماعت کا وفد اپنا موقف پیش کر رہا تھا تو اس وقت ان کے سامنے یہ پیشکش رکھی جا رہی تھی کہ تم اپنے ضمیر کے خلاف ملک کے آئین کے خلاف اسلام کی تعلیمات کے خلاف فیصلہ قبول کر لو تو ہم تمہیں تمہارے کچھ حقوق دے دیں گے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارے حقوق محفوظ نہیں رہیں گے۔ کوئی بھی صاحبِ ضمیر اس قسم کے گئے گزرے ہتھکنڈوں کی تائید نہیں کر سکتا۔ ان کا موقف تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ تم اس ملک کے شہری ہو۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ہر حال میں تمہارے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ تمہارا عقیدہ جو بھی ہو اس سے تمہارے حقوق پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس کے علاوہ انہوں نے تسلی دلائی کہ غیر مسلم قرار دیئے جانے کے بعد بھی آپ اپنے مذہب کو profess, practice اور propagate کر سکتے ہیں۔ یہ بھی صرف دکھانے کے دانت ہی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی ایک ملک یا ایک معاشرے میں مذہبی تنگ نظری کا سفر شروع ہو جائے تو یہ معاشرہ گرتے گرتے ایک مقام پر رکتا نہیں بلکہ تنگ نظری کی کھائی میں گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ جب تک کہ وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے واپسی کا سفر شروع نہ کرے۔ پاکستان بھی تنگ نظری کی کھائی میں گرتا چلا گیا۔ اور ۱۹۸۴ء کے آرڈیننس میں جماعت سے اپنا مذہب profess, practice اور propagate کرنے کے حقوق چھیننے کی کوشش بھی کی گئی اور یہ تعصب صرف جماعتِ احمدیہ تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور اس وقت سے اب تک کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ پاکستان میں احمدیوں کے حقوق محفوظ نہیں رہے۔ جب اٹارنی جنرل صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ اگر آپ کو غیر مسلم قرار دے دیا جائے تو اس سے آپ کے حقوق محفوظ ہو جائیں گے۔ اس پر حضور نے واضح طور پر فرمایا

Then we do not want our rights to be protecetd.

یعنی اس صورت میں ہم نہیں چاہتے کہ اس طرح ہمارے حقوق محفوظ کئے جائیں۔

اس پیشکش کے مسترد ہونے پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا

It is upto you

یعنی: ''آپ کی مرضی''

اس پر حضور نے فرمایا

''ہاں بالکل''

قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں ان الفاظ میں یہ پیشکش کی گئی اور حضرت امام جماعتِ احمدیہ نے واضح الفاظ میں اس پیشکش کو مسترد فرما دیا۔ ہر پڑھنے والا خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ کس کا موقف اصولوں پر قائم تھا۔ اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس دوٹوک جواب کے بعد یحیٰ بختیار صاحب کے سوالات کی ڈولتی ہوئی ناؤ نے کسی اور سمت کا رخ کیا۔ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے 21 جون 1974 کے خطبہ جمعہ کا یہ حوالہ پڑھا

''خدا تعالیٰ اپنے فعل سے ثابت کرے گا کون مومن ہے اور کون کافر ہے۔''

وہ محض ایک فقرہ پڑھ رہے تھے۔ ہم پورا اقتباس درج کر دیتے ہیں

''پس تم وہ بات کیوں کرتے ہو جس کا تمہیں تمہارے اس دستور نے حق نہیں دیا جس دستور کو تم نے ہاتھ میں پکڑ کر دنیا میں یہ اعلان کیا تھا کہ دیکھو کتنا اچھا اور کتنا حسین دستور ہے۔ آج اس دستور کی مٹی پلید کرنے کی کوشش نہ کرو اور اس جھگڑے میں نہ پڑو اور اسے خدا پر چھوڑ دو کیونکہ مذہب دل کا معاملہ ہے۔ خدا تعالیٰ اپنے فعل سے ثابت کرے گا کہ کون مومن اور کون کافر ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں بھی جب اس قسم کے شور پڑتے تھے تو آپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ یہاں کیوں شور مچاتے ہو امن سے آشتی سے اور صلح سے زندگی گذارو۔ جب ہم اس دنیا سے گزر جائیں گے اور خدا تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے تو خود پتہ چل جائے گا کہ کون مومن؟ اور کون کافر؟''

(خطباتِ ناصر جلد 5 ص 574)

بہر حال اس خطبہ جمعہ کا یہ فقرہ پڑھ کر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ اگر اس کے باوجود کہ آپ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، اگر میں یا کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ آپ مسلمان نہیں تو کیا یہ آپ

کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہوگی؟

اس کے بعد خدا جانے وہ کیا سوال اُٹھانے لگے تھے؟ اس پر حضور نے ایک بنیادی فرق کی نشاندہی فرمائی اور فرمایا:-

''یہاں یہ سوال نہیں زید بکر کو مسلمان کہتا ہے یا نہیں۔سوال یہ ہے کہ کیا یہ حکومت کا حق ہے کہ کسی کو دنیاوی لحاظ سے، سیاسی لحاظ سے، غیر مسلم قرار دے اور اس کا اعلان کردے؟''

غالباً یحیٰ بختیار صاحب یہ نکتہ اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ صدیوں سے علماء کفر کے فتاویٰ دیتے چلے آرہے ہیں تو اب یہ کیسے ناجائز ہوگیا؟ اس موقع پر ان کا ذکر کر کے کفر کے فتاویٰ کے بارے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا:-

''......ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان فتاویٰ کا یہ مطلب ہے کہ ان کے نزدیک جن پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے ان کے اعتقادات یا اعمال اللہ کو پسند نہیں اور قیامت کے دن ان سے مواخذہ کیا جائے گا۔ ہمارے نزدیک فتاویٰ کا اس سے زیادہ اور مطلب نہیں۔اور سیاسی طور پر کسی کا یہ حق نہیں کہ ان تین احادیث کی روشنی میں جو محضر نامے میں ہیں، سیاسی طور پر کسی حکومت کو حق نہیں ہے کہ کسی فرقے کو کافر قرار دے......''

اس موقع پر اٹارنی جنرل صاحب کسی نامعلوم وجہ سے یہ دور کی کوڑی لائے کہ علماء نے جو ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے دیئے ہیں وہ جذبات میں الیکشن کے جوش میں ایک دوسرے کو کافر کہہ دیا تھا۔یہ بالکل لایعنی دعویٰ تھا اس پر حضور نے فرمایا کہ الیکشن تو اب شروع ہوئے ہیں اور یہ فتوے صدیوں سے دیئے جارہے ہیں۔

پھر اٹارنی جنرل صاحب نے سوالات پوچھے کہ کیا احمدی مرزا صاحب کو نبی سمجھتے ہیں۔اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے یہ پُر معارف جواب دیا کہ نہیں، ہم انہیں امتی نبی سمجھتے ہیں۔

اور پھر فرمایا کہ نبی ہونے اور امتی نبی ہونے میں بہت فرق ہے۔جب اٹارنی جنرل صاحب نے وضاحت کرنے کے لیے کہا تو اس پر حضور نے فرمایا:-

''امتی نبی کے یہ معنی ہیں کہ وہ شخص نبی اکرم ﷺ کے عشق و محبت میں اپنی......زندگی گزار رہا ہے۔اس کو ہم امتی کہیں گے۔قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ......میری اتباع کرو گے

تو اللہ تعالیٰ کی محبت کو پاؤ گے۔امتی کے معنی یہ ہیں کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نبی اکرم ﷺ کے کامل متبع تھے اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی روحانی برکت اور فیض نبی اکرم ﷺ کی اتباع کے بغیر حاصل ہو نہیں سکتا۔"

اس کے بعد یہ بات شروع ہوئی کہ احمدیوں کے نزدیک جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا انکار کرے اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے اور کفر کے کیا کیا مطالب ہو سکتے ہیں، شرعی اور غیر شرعی نبی میں کیا فرق ہوتا ہے۔

اب یہ امید پیدا ہو چلی تھی کہ اب سارا دن گزار کر شاید اٹارنی جنرل صاحب موضوع پر آئیں اور کچھ علمی اور پر معرفت باتیں سننے کو ملیں لیکن چند منٹ ہی گزرے تھے کہ یحیٰی بختیار صاحب اچانک بغیر کسی تمہید کے پٹری سے اترے اور ایسا اترے کہ بہت دور نکل گئے۔انہوں نے اچانک سوال کیا آپ اپنے لیے تو تواضع پسند کرتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے تواضع نہیں ظاہر کرتے اور اس الزام کے حق میں اٹارنی جنرل صاحب نے اپنی طرف سے جو دلیل پیش فرمائی وہ یہ تھی کہ آپ نے یہ تقاضا کیا تھا کہ آپ کے نام جو خط آئے وہ امام جماعتِ احمدیہ کے نام آئے ، جب کہ آپ نے اپنے انگریزی میں لکھے گئے ضمیمہ میں مودودی صاحب کا نام مسٹر مودودی لکھا ہے، جب کہ ان کے پیروکار انہیں مولانا مودودی کہتے ہیں۔ان کا اصرار تھا کہ اس طرح مودودی صاحب کی تحقیر ہوتی ہے اور ان کی جماعت کے لوگوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں حکومت کی طرف سے ایک خط ملا جس میں حضرت خلیفۃ المسیح کا ذکر کرنا تھا لیکن قومی اسمبلی کے سیکریٹری نے ان کے لئے انجمن احمدیہ کے ہیڈ کے الفاظ استعمال کئے۔ **حقیقت یہ ہے کہ صدر انجمن احمدیہ کا صدر صرف جماعت کی اس تنظیم کا سربراہ ہوتا ہے اور وہ امام جماعتِ احمدیہ نہیں ہوتا**۔یہ بات نہ صرف احمدیوں میں بلکہ غیر احمدیوں میں بھی معروف ہے۔اس غلطی کی ضروری تصحیح کی گئی تھی اور وہ تصحیح بھی حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی طرف سے نہیں بلکہ ایڈیشنل ناظر اعلیٰ صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب کی طرف سے بھجوائی گئی تھی لیکن اٹارنی جنرل صاحب باوجود وکیل ہونے کے اس موٹی بات کو سمجھنے سے بھی قاصر تھے اور اس غلطی کو بنیاد بنا کر ایک لایعنی اور غیر متعلقہ اعتراض کر رہے تھے۔اس کے جواب میں